اُردو فکشن میں ''خط تقدیر'' کی اہمیت

ڈاکٹر نسیمہ رحمان، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

Though in Urdu literature, the tradition of presenting moral stories in allegorical manners can be traced back in 17th century, but we find such an allegory in form of Khat-e-Taqdeer in the second half of 19th century which occupies the place of first and foremost allegory in Urdu prose written in Lahore at the time .This allegory written by Maulve Kareem-ud-din is considered important not only with reference to foremost allegory written in Lahore nevertheless the preface of this allegory is important for us as it is the first reflection of progressive school of thought on critical level in fiction. In this article the importance of Khat -e- Taqdeer from these two references has been discussed .

مولوی کریم الدین ڈپٹی انسپکٹر مدارس حلقہ لاہور نے ۱۸۶۴ء کے درمیان یہ قصہ نثر میں مخلوط بہ نظم کپتان فلر کے حکم پر تصنیف کیا اور مطبع سرکاری لاہور سے پہلی ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔(۱) مضمون نگار کے پیش نظر ''خط تقدیر'' کی پہلی اشاعت ہے جس کے سرورق کی عبارت درج ذیل ہے:

خط تقدیر
حسب الحکم
جناب کپتان فلر صاحب بہادر ڈائریکٹر
پبلک انسٹرکشن مدارس ممالک پنجاب کے
مولوی کریم الدین
ڈپٹی انسپکٹر مدارس
لاہور نے
درمیان ۱۸۶۴ء تصنیف کیا اور ۱۸۶۵ء

مطبع سرکاری واقع لاہور میں باہتمام بابو چندر ناتھہ متر کیوریٹر کے چھپا۔

اخلاقیات کے موضوع پر تحریر کیے گئے اس قصہ میں ناول اور تمثیل نگاری کے عناصر کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ ہر چند کہ ڈاکٹر محمود الٰہی اسے اردو کا پہلا اصلاحی ناول قرار دیتے ہیں(۲) لیکن درحقیقت یہ ناول سے زیادہ تمثیل نگاری کے زیادہ قریب ہے۔ جس میں غیر مجسم کو مجسم بنا کر پیش کیا جاتا ہے بالفاظ دیگر حیوان یا غیر ذی روح کرداروں کے بجائے اخلاقی اور سماجی محاسن و عیوب اور اقدار کو کردار کی شکل دے کر معاشرتی پس منظر کے ساتھ پیش کر دیا جائے۔ ''خط تقدیر'' ایسا ہی ایک اخلاقی قصہ ہے جو تمثیلی انداز لیے ہوئے ہے۔ اس میں ایسے واقعات ہیں جو قرین قیاس ہیں ان واقعات کے ذریعے یہ باور کرایا گیا ہے کہ تدبیر کے بغیر تقدیر کا لکھا ہوا پورا نہیں ہوتا۔ لہٰذا محض تقدیر پر بھروسا کر کے بیٹھ رہنا اور تدبیر نہ کرنا بہت بڑی حماقت ہے۔ جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوتا۔ اگر چہ قصہ تمثیلی صورت میں طلباء کی اخلاقی تربیت اور ان کے شوق کو پیش نظر رکھتے ہوئے تصنیف کیا گیا ہے لیکن درحقیقت اس نے لاہور میں انیسویں صدی کے نصف دوم میں اردو نثر میں تمثیل نگاری کی روایت کو تقویت دی نیز ''خط تقدیر'' کی صورت میں اس عہد کا اہم نثری نمونہ بھی میسر آیا۔ یوں تو اردو نثر میں تمثیل نگاری کا آغاز سترھویں صدی میں ملا وجہی کی ''سب رس'' سے ہو چکا تھا اور بعد ازاں اس تمثیلی رجحان کا اظہار داستانوں اور قصوں میں غیر ذی روح کرداروں کی شکل میں ہوتا رہا لیکن لاہور میں لکھی گئی اردو نثر میں تمثیل نگاری کا آغاز ''جوہر عقل'' مصنفہ منشی عزیز الدین خان (۱۸۶۴ء) اور ''خط تقدیر'' سے ہوتا ہے۔

''خط تقدیر'' کا تمثیلی قصہ گیارہ ابواب پر مشتمل ہے جن کی تفصیل اس طرح سے ہے:

پہلی سیر: اس میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ جب آدمی تدبیر سے لاچار ہو جاتا ہے تو حیران اور پریشان ہو کر حواس باختہ رہتا ہے۔ اس وقت اس کی عقل درست نہیں ہوتی۔

دوسری سیر: اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ بچے کو علم سیکھنے پر کس طرح محنت کرنی چاہیے اور چلن اس کا کیا ہونا مناسب ہے پھر اگر روزگار درکار ہو تو سوداگری، نوکری، ہنر زراعت یہ طور کمانے کے ہیں جو نسا پیشہ چاہیے اختیار کرے۔

تیسری سیر: دربار تقدیر- ممالک مشورہ باشندگان دنیا کے خصائل بلحاظ ان ملکوں کے اور قدرت خدا کا ظہور اور تقدیر اور تدبیر کا بیان کہ وہ کیا شے ہے۔

چوتھی سیر: طالب تقدیر کا عیش اڑانا، اس میں دکھایا ہے کہ جب انسان کو بغیر محنت کے دولت ملتی ہے تو وہ کس طرح برباد کرتا ہے۔

پانچویں سیر: اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ بخت اور اتفاق کو مانتے اور تدبیر کو کچھ نہیں جانتے وہ خطا کرتے ہیں اور جو بے تدبیری سے دولت کو خرچ کرتے ہیں آخر کو انجام ان کا خراب ہوتا ہے۔

چھٹی سیر: اس میں دکھایا گیا ہے کہ تدبیر ہی بگڑ جانے کا نام تقدیر کا بگڑنا ہے اور دولت اور حسن اور علم روز ازل سے کن کو ملے ہیں۔ بہت لوگوں نے بیہودہ پیشہ بنا کر دنیا کے لوگوں کو بہکانے کے لیے طریق ایجاد کیے ہیں ایسے لوگوں سے بچنا چاہیے ان کی تعلیم میں خرابی ہے۔

ساتویں سیر: اس میں یہ دکھایا ہے کہ انسان کے دل پر جو خدا کی طرف سے فیضان ہوتا ہے وہ انسان کو برائی سے بچنے کی درست تدبیر بتاتا ہے۔

آٹھویں سیر: فوائد علم کی کیا وجہ ہے جو ہندوستانی لوگ یورپ والوں کے برابر یا ہنر میں نہیں ہو سکتے۔ انگریزی سیکھنے کی ترغیب؛ سفر کرنا اور تعصب سے بچنا چاہیے تاکہ جلد ہی روشن دل ہو جائیں۔ (اس سیر میں سوال و جواب کی صورت میں فوائد علم بتائے گئے ہیں)۔

نویں سیر: حضرت سکہ کا دربار اس میں زر کا بیان ہے اور خست اور شراب خوری کی برائی، کفایت شعاری کی تعریف، خوشی حاصل کرنے کے طور کا بیان کیا ہے۔

دسویں سیر: خوبصورتی کا بیان شعراء کی تشابیہ۔

گیارہویں سیر: بادشاہی دربار میں عقل کا جانا دلیل معقول کا لانا۔ ملکہ تقدیر سے پھر ملوانا۔

مذکورہ تمام ابواب میں حسب ضرورت مثنوی، غزل، بیت، فرد کی صورت میں شعری پیوند کاری سے قصہ میں تاثیر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر باب میں مختلف موضوعات بچپن کی تعلیم و تربیت، چال چلن، تدبیر سے لاچاری، تقدیر کا کارنامہ، فضول خرچی، علم کے فوائد، یورپ کے علم و ہنر کی برتری، ہندوستانیوں کی پسماندگی، انگریزی تعلیم کی اہمیت اور برتری، بے تعصبی، کفایت شعاری، عقل کی چالاکی وغیرہ کو مدنظر رکھ کر مستان شاہ کے ذریعے قصہ بیان کیا ہے اور عقل، تقدیر، چترائی، خوشی، تدبیر، دولت، خوبصورتی یا فیضان آمدنی، کفایت شعاری اور خرچ کو مجسّم بنا کر ان تمثیلی کرداروں کے ذریعے قصہ گوئی کی منازل طے کی ہیں۔ قصہ کے تمام کردار اپنے عمل سے اپنی پہچان اور وضاحت کرتے ہیں مثلاً یہ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> ''چترائی نے جھٹ پٹ بن بنا چوٹی کنگھی کر کپڑے بدل چھل چھلا اپنی شکل اور ہی بدل باتمیا زتمام ٹھمک چال چل آہستہ آہستہ خراماں خراماں شادمان وفرحان اوس مستانہ کے پاس جا کر اوسکے کان کے پاس مونھ لگا کر چپکے سے یھ کہدیا کہ جس کے تم طالب دیدار ہو اور جسپر تم مفتون ہو اوس نے مجکو بھیجا ہے اور یہہ پیغام دیا ہے کہ اگر ہمکو تو حقیقت میں چاہتا ہے اور دل سے ہمارا شائق ہے اور سچا ہمارا عاشق ہے تو بھی تیرا امتحان ہے کہ عقل جو کوتوال جہان ہے اوس سے اپنا سب ماجرا جو تجھ پر گذرا ہو بیان کر ساری حقیقت کہول دہر بادشاہ اسملک کا بہت بڑا دانا اور رحیم ہے نہایت رعایا پرور مہربان اور کریم ہے کیا عجب ہے جو کوتوال تیری حقیقت حال وزیر تک پہنچا دے اور وزیر بادشاہ کیخدمت میں پوست کندہ عرض کرے اور

سناوے اور بادشاہ کو تیری غربت اور کلفت پر رحم آوے پھر وزیر کو حکم ہو تو تیرا سب درد الم ہو پر یھہ شرط ہے کہ ذرا تفاوت نکرنا ہو بہو سب قصہ جو تجھپر بیتا ہے یا اب گذر رہا ہے بے تامل ابتدا سے انتھا تک کھ سنانا آگے تیری تقدیر ہے یہی میرے اور تیرے ملنے کی تدبیر ہے یھہ سنتے ہی مستان شاہ ہوشیار ہو گئے کہتا کہنے کو تیار ہو گئے باچھین کہل گئیں سب کدورتین دلکی دہل گئیں۔'' (۳)

مستان شاہ اپنی کہانی اس طور عقل کے گوش گزار کرتا ہے:

''غریب پرور حال مختصر اس مجنونکا یہہ ہے کہ نام بندیکا طالب تقدیر ہے گہر کا دولتمند ہے نہ فقیر ہے غریب آدمیکا بیٹا ہوں نوکر یکا پیشہ کرتا ہوں حالت صبیامین جب بندہ کو ہوش آیا تو والد نے علم سکہلایا بچہ پن میں علم سیکہنے پر ایسا دہیان لگایا کہ چند سال میں اپنے ہمعصرون پر سبقت لیجا کر بڑا نام پایا میرے ہم مکتب لڑکے مجھسے سیکہنے آیا کرتے میرے ہمسبق ہمیشہ مجسے پڑھتے میرے سب اوستاد مجسے خوش رہتے ہر سال بعد امتحان کے انعام پاتا حکام کی نظروں میں سب سے اول سماتا اخلاق میرے ایسے تھے کہ مانباپ تو خوش رہتے ہی تہے ہمسایہ کے پڑوسی قرب و جوار کے محلے والے جومجکو جانتے تھے نیکی مین مانتے تھے۔۔۔ میرا عمل بچپن سے اس نصیحت پر رہا کہ سبق یاد کر لینا اور پچھلا پڑھا ہوا نہ بہلانا وقت پر جب میرے بزرگ اجازت دیں تب کہانا کہانا بدصحبت میں نہ جانا ٹہیک دس بجے مدرسہ پہنچنا اور سبق چونکہ پہلے ہی سے یاد کر کے لیجاتا تہا اس لیے لڑکون میں سب سے اول نمبر پاتا تہا وقت تعلیم کے ایسا دہیان لگا کر پڑہتا جو لفظ نیا پایا اوس معنی اپنی زبانمین لکہہ لیتا اور اوسی جگہ یاد کر لیتا۔'' (۴)

یوں قصہ میں منطقی استدلال، عقلی دلائل اور حقیت نگاری کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے وہ تمثیلی ہے۔ جس کے ذریعے تعلیم و تربیت کی اہمیت بھی اجاگر کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر قصہ کی فضا آغاز سے اختتام تک تمثیلی رہتی ہے اور تمثیل نگاری کے اس رجحان کو ناول کی طرف بڑھتے ہوئے شعور کی قریبی کڑی قرار دیا جا سکتا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف دوم کے کلونیل عہد میں محکمہ تعلیم کے لیے لکھے جانے والے دیگر درسی قصوں (۵) کی طرح اس قصہ میں بھی انگریزوں کی آمد کے ثمرات بیان کیے گئے ہیں۔

''وہ زمانہ اب گیا جبکہ مسافر لوگ دہاڑے لٹا کرتے اور صدہا آدمی بکرونکی طرح کٹا کرتے اب وہ زمانہ نہیں ہے جس میں کوئی مسافر یا تاجر بدون بدرقہ یا سپاہ کے سفر نہ کر سکتا تہا ذرا قدم شہر کے باہر ندہر سکتا تہا۔ انگریزوں نے ایسی راہ صاف کی ہے کہ دنیا کو غارت گری سے معاوف کی ہے اس زمانہ میں اگر کوی مسافر جنگل میں سونا اچہالتا چلا جاوے تو کوئی بھی اوسکے سامنے نہ آوے۔'' (۶)

لاہور کی اردو نثر میں ''خط تقدیر'' مقصدی، اصلاحی تمثیلی قصہ ہونے کے ساتھ ایک اور حیثیت سے بھی اہمیت کی حامل ہے اور یہ اہمیت اس قصہ کے دیباچہ کی ہے جو اردو فکشن کی تنقید میں نقش اول کی حیثیت رکھتا ہے اگرچہ مولوی کریم الدین کا مقصد فکشن کی تنقید لکھنا نہیں تھا لیکن ان کے ذہن میں جو خیالات اور تصورات پرورش پا رہے تھے جنہیں دیباچہ میں پیش کیا گیا ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اردو افسانوی ادب کو تنقیدی نگاہ سے بھی پرکھ رہے تھے۔ اس عہد میں موجود فکشن کی روایت کے پیش نظر جو نیا تنقیدی معیار مولوی کریم الدین متعارف کروا رہے تھے وہ نئے حالات اور جدید تقاضوں کا ہی نتیجہ تھا کیونکہ انیسویں صدی میں بدلتے ہوئے حالات اور جدید علوم کی روشنی نے ذہنوں کو جلا بخشی وہیں انسانی شعور میں پختگی آئی، محض خیال آرائی کی بجائے حقیقت نگاری کو اہمیت دی جانے لگی۔ چنانچہ تمثیل نگاری کی صنف نے ''خط تقدیر'' کی صورت میں جنم لیا اور اس کے دیباچے سے لاہور میں اردو فکشن کی تنقید کا آغاز ہوا۔ جو اس عہد میں ادب اور شعور کے فطری تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ ''خط تقدیر'' کے دیباچے میں مولوی کریم الدین نے قصہ گوئی کے بدلتے ہوئے رجحان کے بارے میں جن جدید تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ملاحظہ ہوں:

> ''مدت سے دل میں یہہ امنگ تھی کہ تقدیر و تدبیر کا مضمون بطور قصہ لکھا جاوے بشرطیکہ مخالف کسی مذہب اور خلاف رائے اہل فلسفہ کے بھی نہو اور جو باتیں اوس میں درج ہون وے اخلاق و اطوار اور تجربات انسانی ایسی طرحکے ہون جنکا اثر طبع انسان پر ہوکے بہت نیک نتیجہ پیدا کریں اور کہانی ایسی طور پر ہو کہ جو شخص پڑھے یا سنے اوسکو خیال ہو کہ یہہ قصہ میرے ہی حسب حال لکھا گیا ہے اور زبان اوس قصہ کی اردو خالص اور سلیس اور محاورات دلچسپ روزمرہ ٹھیک اشعار حسب موقع قابل یاد رکھنے کے ہوں تا کہ اس زمانہ کے طلباء کو شوق نئی تصنیف کرنے اور مضامین حقیقیہ لکھنے کی ترغیب ہومگر ایشائی قصونکی روش اور اطوار کو چھوڑ کر نئی چال چلنا بہتر ہے ۔۔۔ چونکہ اونکو (قدیم قصہ نگاروں) خوب یقین تھا کہ قصے خوانی سے صرف یہی فائدہ ہے کہ غمگین کا دل بہلے اور ناشاد کی خاطر ناشاد ہوسواء اس کے اور کچھ غرض تصنیف قصہ سے نرکھتے تھے بلکہ وہ فائیدہ عظیم قصہ خوانیکا جو کہ اب متاخرین نے سمجھہ لیا ہے اونکے خیالمین بھی نہ آتا تہا اس لیے نہایت جھوٹی باتیں اپنی طبعیت سے اختراع کین پر قصہ نویسی کے نتیجے اہم اور غرض اعظم کیطرف اونکا ذہن نہ گیا وہ یہہ تہا کہ جسطرحپر قصہ خوانی سے دل بہلتا ہے اور آدمی کا غم ٹلتا ہے اوسیطرحپر طبائع انسانی بھی اوس قصہ کا ایسی طرحپر ہو جایا کرتا ہے کہ جس روشکی باتیں اوس کہانیمین درج ہوتی ہیں اونکے مطابق پڑھنے اور سننے والونمین ایسی عادات پیدا ہو جاتی ہین کہ اونکو ہرگز خبر بہی نہیں ہوتی کہ ہم میں عادات بد یا نیک پیدا ہوگئی ہین یا آنکہ اس کہانیکا یہہ اثر ہمپر ہوگیا ہے۔''(۷)

مذکورہ بالا تنقیدی خیالات کا بغور مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ مولوی کریم الدین اپنے عہد میں جدید ترقی پسند خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ قصہ میں ''جو باتیں اسمیں درج ہوں وے اخلاق و اطوار اور تجربات انسانی ایسی طرحکے ہوں جنکا اثر طبع انسانی پر ہو'' تو درحقیقت وہ قصہ کہانی کو مقصدیت اور اصلاح کے آلہ کار کے طور پر استعمال کرنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ بالفاظ دیگر افادی ادب کی بات کر رہے تھے پھر جب یہ کہتے ہیں کہ ''کہانی ایسی طور پر ہو کہ جو شخص پڑھے یا سنے اوسکو خیال ہو کہ یہہ قصہ میرے ہی حسب حال لکھا گیا ہے'' تو وہ حقیقت نگاری پر زور دیتے ہوئے ادب برائے زندگی کے نظریہ کو بیان کر رہے تھے۔ چنانچہ وہ قصہ نگاری کے اصلاحی مقصدی اور حقیقی زندگی پر مبنی عناصر کی اہمیت واضح کر رہے تھے جسے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ترقی پسند تحریک نے اپنا واضح منشور بنایا۔ اس کے اولین نقوش اس دیباچہ کی صورت میں انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں مولوی کریم الدین بیان کر رہے تھے۔ روش عام سے ہٹ کر چلنا یعنی روایت سے بغاوت کرنا رومانیت کا طرہ امتیاز ہے۔ جو ان تنقیدی خیالات میں بھی موجود ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ''ایشیائی قصونکی روش اور اطوار کو چھوڑ کر نئی چال چلنا بہتر ہے۔'' تو ان کے خیالات میں رومانیت کی کارفرمائی بھی اس حد تک نظر آتی ہے کہ روش عام سے بغاوت کرتے ہوئے یہ قصہ تحریر کر رہے ہیں اور پھر کسی خوبی سے چند جملوں میں قصہ نگاری کی پوری روایت پر تنقید کر ڈالی ہے۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ''قصہ نویسی کے نتیجے اہم اور غرض اعظم کی طرف اونکا (قدیم قصہ نگاروں) ذہن نہ گیا وہ یہہ تھا کہ جسطرح قصہ خوانی سے دل بہلتا ہے اور آدمی کا غم ٹلتا ہے اوسیطرحپر طبائع انسانی پر اثر بھی اوس قصہ کا ایسی طرحپر ہو جایا کرتا ہے کہ جس روشکی باتیں اوس کہانمیں درج ہوتی ہیں اونکے مطابق پڑھنے اور سننے والونمیں ایسی عادت پیدا ہو جاتی ہیں کہ اونکو ہرگز خبر بہی نہیں ہوتی کہ ہم مین عادات بد یا نیک پیدا ہوئی ہین یا آنکہ اس کہانیکا یہہ اثر ہمپر ہو گیا ہے۔'' یعنی کہانی چونکہ انسانی فطرت پر اثر کرتی ہے اس لیے اسے بہترین آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جانا چاہیے۔ مولوی کریم الدین قصہ نگاری کی روایت سے بغاوت ضرور کرتے ہیں لیکن روایتی قصہ نگاری میں ''دل کے بہلنے'' اور ''غم کے ٹلنے'' کی اہمیت و افادیت کے معترف بھی ہیں۔ یوں وہ یکسر روایت کو رد نہیں کرتے بلکہ اس کی مثبت باتوں کو بدلتے حالات اور جدید نظریات سے ہمکنار کرتے ہیں لہٰذا ان کے تنقیدی خیالات میں اعتدال بھی ہے۔

بلاشبہ اردو میں افسانوی تنقید کا آغاز اس دیباچے ہی سے ہوتا ہے۔ جس میں جدید تنقیدی شعور کا احساس واضح ہے جو تمثیل نگاری میں اساسی اہمیت رکھتا ہے جبکہ ناول میں بھی ان خیالات کی اہمیت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ ایک لمحے کے لیے تنقید کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ تذکرے، تبصرے اور تقریظ شعری و لسانی تنقید کی صورت میں موجود رہے ہیں جبکہ اردو فکشن میں تنقید کی روایت تقریباً معدوم تھی۔ جو تھوڑی بہت دکھائی دیتی ہے اس کی حیثیت رائے سے زیادہ نہ تھی، البتہ اردو نثری قصوں مثلاً ''سب رس''، ''نوطرز

مرصع''،'' باغ و بہار''،'' داستان امیر حمزہ ''،'' فسانۂ عجائب''،'' عجائب القصص'' کے دیباچے میں تنقیدی اشارے ضرور موجود رہے ہیں۔لیکن اس مربوط صورت میں نہیں جیسے'' خط تقدیر '' کے دیباچے میں بیان ہوئے ہیں۔ ابتدأ تخلیق کار ہی نقاد کے فرائض انجام دیتا نظر آ تا ہے اس طرح تخلیق کے بطن سے ہی تنقید نے جنم لیا۔ چنانچہ درحقیقت لاہور میں اردو نثر میں فکشن کی تنقید میں جدید خیالات اور پختہ تنقیدی شعور موجود تھا۔جس کا نقطہ آغاز'' خط تقدیر '' کا دیباچہ ہے جس کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں مولوی کریم الدین نے قدیم طرز کے قصوں پر موضوع اور اسلوب پر دو اعتبار سے تنقید کرتے ہوئے ان سے نہ صرف بے زاری کا اظہار کیا ہے بلکہ نہایت صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ کہانی کی بنیاد انسانی تجربات و مشاہدات پر رکھی جائے تا کہ اس کا اثر طبع انسانی پر ہو اور اس سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہو سکے۔ بالفاظ دیگر افسانوی ادب میں مقصدیت کی بات کرتے ہوئے ادب برائے زندگی کی بات کی گئی ہے۔

بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر مولوی کریم الدین کے ذہن میں نشوونما پانے والے جدید خیالات نے بھانپ لیا تھا کہ ایسے قصے اور کہانیوں سے اجتناب کیا جائے جن میں پڑھنے اور سننے والوں کو اپنی زندگی اور اپنا معاشرہ دکھائی نہ دے۔اسی لیے ڈاکٹر محمود الٰہی کا یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ'' خط تقدیر '' کے دیباچے میں انہوں نے قصہ نگاری کے فن پر جو کچھ لکھا ہے اسے روایتی قصہ نگاروں کی پہلی شدید مخالفت اور نئے طرز کے قصوں کو رواج دینے کی پہلی شعوری کوشش سے تعبیر کرنا غلط نہ ہوگا۔''(۸) اس حوالے سے دیکھیں تو مولوی کریم الدین ۱۸۶۴ء میں ادب میں حقیقت نگاری کی بات کرتے نظر آتے ہیں اور قصوں کو حقیقی زندگی اور معاشرے کا عکاس بنانے پر یقین رکھتے ہیں۔ نیز قصہ خوانی کی اہمیت بتاتے ہیں کہ یہ انسان کو خوشی اور انبساط کے ساتھ بصیرت اور بصارت بھی بخشتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی مرتبہ کریم الدین کے ہاں قصہ کی افادیت و مقصدیت کا احساس؛ مقصد کو فن کے سانچوں میں ڈھالنے؛ ہمہ گیر موضوعات کا انتخاب کرنے؛ قصہ کی بنیاد اخلاق واطوار اور تجربات انسانی پر رکھنے کا شعور ملتا ہے۔مولوی کریم الدین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قصہ چونکہ انسانی طبع پر اثر پذیر ہوتا ہے اس لیے اس سے معاشرے اور انسان کو بدلنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اس طرح افسانوی ادب کو انسان اور معاشرے کے جذبات اور خیالات کی تطہیر کا ذریعہ بتایا ہے جو کتھارسس کا کام بھی کرتا ہے۔معاشرے اور انسان کو بدلنے والی یہ تبدیلی کیا اور کیسی ہونی چاہیے؟ اس نقطہ کو بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے'' خط تقدیر '' کے قصے کا تانا بانا بنا ہے اور اپنے مذکورہ خیال کو عملی صورت دی ہے۔ کریم الدین عام انسان کو کہانی کا موضوع بنانے پر زور دیتے ہیں جس کی زندگی کا ایک بڑا حصہ احتجاج اور احتیاج کی نذر ہو جاتا ہے۔ جہاں ہر قدم پر مسائل کا سامنا رہتا ہے اور ان کے حل کے لیے انسان کی عقل اور تدبیر کام آتی ہے۔افسوس! کہ اپنے عہد کے سماجی تہذیبی اور فکری پس منظر سے گہری واقفیت کی بنا پر جن پختہ تنقیدی خیالات کو کریم الدین نے دیباچہ میں بیان کیا ہے۔اس کا مکمل عملی نمونہ ''خط تقدیر''

میں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اردو نثر میں دیباچہ ''خط تقدیر'' میں پہلی بار افسانوی تنقید میں انقلاب آفرین اور مدلل وضاحت کے ساتھ بات کی گئی ہے۔ اس حوالے سے مولوی کریم الدین فکشن میں پہلے باضابطہ نقاد کے طور پر بھی اپنی شناخت کرواتے ہیں۔ لہٰذا اردو افسانے کی تنقیدی تاریخ اور ارتقا کے تناظر میں ''خط تقدیر'' کا دیباچہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

حواشی:

۱۔ امداد صابری (''تاریخ صحافت اردو'' (جلد اول) ص:۲۷۶) اور عظیم الشان صدیقی (''اردو ناول کا آغاز و ارتقا'' ص:۱۰۹) اس کا سن تصنیف ۱۸۶۲ء کے درمیان بتاتے ہیں۔ مضمون نگار کے مطابق ان ادبا سے سہو ہوا ہے۔ دراصل اس کا سن تصنیف ۱۸۶۴ء ہے۔ مذکورہ ادبا سے سہو ہونا فطری تھا کیونکہ ۴ اور ۲ کے لکھنے میں بے حد مماثلث ہے اور اس زمانے میں ۴ کے ہندسہ کو بیشتر ایسے ہی لکھا جاتا تھا کہ اس پر ۲ کا گمان گذرتا ہے۔ اس حقیقت کا انکشاف مقالہ نگار کو ''رسوم ہند'' کی ۱۸۶۹ء کی اشاعت کے صفحات پر درج نمبر شمار سے ہوا۔ جن پر ۲ کا ہندسہ ۴ سے اس درجہ مماثل ہے کہ اگر صفحہ نمبر کی ترتیب کے بغیر دیکھیں تو وہ ۴ ہی لگتا ہے۔ ''خط تقدیر'' کی سن اشاعت کے ضمن میں مضمون نگار کا استدلال یہ ہے کہ اس وقت محکمہ تعلیم کے لیے درسی و نصابی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تصنیف و تالیف کا سلسلہ سرعت سے جاری تھا اور پھر ایسے میں جب طباعت کی سہولتیں بھی میسر ہوں، ممکن نہیں کہ ایک مختصر تمثیلی قصہ ۱۸۶۲ء کے درمیان میں شروع ہو اور ۱۸۶۵ء میں جا کر شائع ہوا ہو۔ چنانچہ اس بناء پر مضمون نگار کا اغلب گمان ہے کہ ۱۸۶۴ء ہی درست سن تصنیف ہے۔ یاد رہے ۱۸۵۷ء میں مولوی کریم الدین درسی تصنیف و تالیف کے سلسلے کا آغاز مسٹر آرنلڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن، ممالک پنجاب کے حکم سے کر چکے تھے۔

۲۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے ''خط تقدیر'' کو اپنے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔

۳۔ کریم الدین، مولوی: ''خط تقدیر'' (لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۶۵ء) ص: ۱۰-۱۱

۴۔ ایضاً، ص: ۱۶-۱۷

۵۔ اس ضمن میں ''نصیحت کا کرن پھول''، ''رسوم ہند'' میں شامل قصے اور ''مجالس النسا'' دیکھے جا سکتے ہیں۔

۶۔ ایضاً، ص: ۲۰

۷۔ ایضاً، ص: ۳

۸۔ ابن کنول: (مرتب) ''تحقیق و تنقید'' (دہلی، کتابی دُنیا، ۲۰۰۶ء) ص: ۲۳۸

مآخذ:

۱۔ ابن کنول (مرتب)۔ تحقیق و تنقید، دہلی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۶ء۔

۲۔ حالی، الطاف حسین، مولانا۔ مجالس النسا، لاہور: مطبع سرکاری، ۱۸۸۱ء۔

۳۔ صابری، امداد امام۔ تاریخ صحافت اردو (جلد اوّل)، دہلی، چوڑی والان، یکم جنوری ۱۹۵۳ء۔

۴۔ آزاد، محمد حسین، مولانا۔ نصیحت کا کرن پھول، لاہور، اسلامیہ سٹیم پریس، ۱۹۱۸ء۔

۵۔ عظیم الشان صدیقی۔ اردو ناول کا آغاز و ارتقا، دہلی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۲۰۰۸ء۔

۶۔ کریم الدین، مولوی۔ خط تقدیر، لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۶۵ء۔

۷۔ مصنف نامعلوم۔ رسوم ہند، لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۶۹ء۔

☆☆☆